ذٰلِکَ الکِتٰبُ لَا رَیبَ فِیہِ

(مولانا سید مناظر احسن گیلانی)

انسان کے ہاتھوں نے اپنے مغز کی باتوں کو کاغذوں پر اوتارا، پھیلایا، اتنا پھیلایا، پھیلاتے رہے گئے کہ انطلانطق کے ایک ساحل کو دوسرے ساحل سے ملایا جاسکتا ہے، کتنی کتابیں، کتنے رسالے کتنے اخبارات، کہ زمین کے کرّہ کو اس میں اب ہم لپیٹ سکتے ہیں، تہوں پر تہیں چڑھا سکتے ہیں اور یقیناً ہماری اور ہمارے ہاتھوں کی انگلیوں کی یہ کمائی پھر بھی بچ جائے گی آخر اُن سیاہیوں کو کون تول سکتا ہے، کاغذ کے اُن دستوں کو کون ناپ سکتا ہے، لکڑی یا لوہے کے اُن ٹکڑوں یا قلموں کو کون گن سکتا ہے جو اب تک اس راہ میں خرچ ہوئے یا آئندہ ہونے والے ہیں

لیکن

جس نے لکھا اور جس کے لئے لکھا گیا، اُن میں کون ہے جس نے یقین کے ساتھ اُن کو لکھا یا یقین کے ساتھ اس کو پڑھا۔ برنارڈ شا کے تمثیلی حکایات ہوں یا شرلاک ہومز کے اختراعی روایات، ہوشربا کی داستانیں ہوں یا پریم چند اور سدرشن کے افسانے۔ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور ہم سے جھوٹ بولا جارہا ہے۔ کیا لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں اس یقین کے سوا اپنے اندر کوئی اور یقین رکھتے ہیں؟ مرزا داغ کا قدم اگر سچ کی چٹانوں پر نہ تھا تو تم سے کس نے کہا کہ مسٹر شیکسپیئر کی تانیں بھی ہوا کے سوا کسی اور چیز کی دیوار پر قائم تھیں؟ مورّخ خود بھی جانتا ہے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے

قیاس اور تخمینہ کے سہارے پر لکھتا ہے اور تاریخ کے پڑھنے والے بھی جانتے ہیں کہ اٹکل سے نکالے ہوئے نتیجوں کے سوا تاریخ کی کتابوں میں اور کچھ نہ ملے گا۔

یہ تو اُن باتوں اور زبان کی درازیوں کا حال ہے جنہیں لکھ کر، ہم نے علم کا لقب عطا کیا ہے۔ لیکن جو واقعی علوم ہیں اور جن کے نتائج پر زندگی کے بے شمار کاروبار چل رہے ہیں، بلاشبہ نتائج تو صحیح ہیں لیکن ان نتائج کے لئے جن قوانین کو ہمارے دماغ نے اصول کی شکل میں پیش کرنا چاہا ہے، تم نہیں جانتے، لیکن اصول کے جاننے والے جانتے ہیں کہ انہوں نے بھی اُن کو اس حد تک نہیں جانا ہے اور شاید جان بھی نہیں سکتے جس کے بعد علم پر یقین کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس غبی اور غیر فلسفی دماغ کو کون فلسفی کہہ سکتا ہے جو اپنی فلسفیانہ کوششوں میں "شک" اور "ارتیاب" "تذبذب" اور "دبدھا" کے خارستانوں تک نہ پہنچ گیا ہو۔ "شک" ہی کے کانٹے اور "تذبذب" ہی کے انگارے فلسفیانہ محنت کی سب سے بڑی اور یقیناً سب سے بڑی قیمتی مزدوری ہیں۔

سائنس اور ریاضی کے نتائج سے کسے انکار ہے کون کہتا ہے کہ دن نہیں ہوتا اور رات نہیں آتی، فصلیں نہیں بدلتیں، موسم نہیں پلٹتے، لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے انشٹائن سے پوچھو کہ جن اصولوں سے ان نتائج کو مختلف زمانوں کے مختلف دماغوں نے وابستہ کیا ہے کیا اس کی وابستگی پر انہیں یقین تھا یا اُس پر یقین کے لفظ کے استعمال کا کوئی حق رکھتا ہے۔

انہیں کہتی ہیں، آدم زاد کی مذہبی جماعتوں میں غل ہے کہ ان کے پاس یقین ہے۔ نصرانی سمجھتے ہیں کہ انجیل یقین ہے، یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ توراۃ میں اطمینان ہے، ہندوؤں سے سنتا ہوں کہ وید میں شانتی ہے، علمی ڈگمگاہٹ کے لئے گیتا میں قرار ہے کہ یہ علام الغیوب کی کتابیں ہیں جنہیں بھی پتا ہے جو گزر چکے اور ان کو بھی جو گزر رہے ہیں اور انہیں بھی جو گزرنے والے ہیں وہ بھی اس کے سامنے ہیں جو ہمارے سامنے ہیں اور وہ بھی جو ہمارے سامنے نہیں ہیں، حالانکہ

علم اتنا محیط ہو، کیا شک ہے کہ یہ اسی کی کتاب، اسی کی تصنیف کہی جا سکتی ہے کہ اس کتاب میں کوئی شک نہیں ہے مگر کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ ان قوموں کے پاس اب وہ کتاب باقی رہ گئی ہے جیسے خدا کے نمائندوں اور رسولوں نے انہیں سپرد کی تھیں، وہ وید ہو یا اوستا، توراۃ ہو یا انجیل، تعلیمات بودھ یا تلقینات کنفوشس، کیا کسی کے پاس وہ چیز اپنی اصلی شکل میں باقی رہ گئی ہے جس شکل میں انہیں ملی تھیں۔ اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی اس پکار سے کانوں میں انگلیاں وہ کیوں ٹھونستے ہیں جو محض اپنی قومی اور ملی انانیت یا خودی کے نشہ میں اس حادثہ کو نہیں دیکھنا یا سننا چاہتے ہیں جو خود ان کے ہاتھوں یا ان کے پیشواؤں کے ہاتھوں سے ان کی کتابوں پر گزر گیا۔

خدا کی باتوں میں انسانی خواہشوں کی خمیر مل گئی ہے، اب اس کو جدا کرنے کی کس میں طاقت ہے؟

پس اب

برٹش میوزیم کی طویل الذیل الماریوں، پیرس اور نیو یارک کی عظیم الشان لائبریریوں، برلن اور ویانا کے لق و دق کتب خانوں، ہاں مشرق و مغرب کے سارے کتابی ذخیروں کے درمیان زمین کے چہرے پر اگر

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ

کا دعوے کسی کتاب کے متعلق کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف وہی کتاب ہے جو شاید ہر مسلمان کے "گھر" میں ہے لیکن غالباً اب کسی کے "اندر" نہیں اِلّا ماشاء اللہ۔